سلیم احمد

شکستِ طلسم رومانیت
یعنی
گڈبائی ٹو اختر شیرانی

(ادبی مکالمہ مابین شبنم صدیقی اور سلیم احمد)

This article presents an extensive dialogue between Shabnam Siddiqui and Saleem Ahmad. The subject of the dialogue is romanticism in Urdu with a special focus on romanticism in Akhtar Sheerani. Both the interlocutors specialize in Akhtar Sheerani's subjects for poetry and his romanticism.

(ابتدائیہ)

آئندہ سطور میں ایک طویل مکالمہ پیش کیا جارہا ھے جو شبنم صدیقی نے سلیم احمد کے ساتھ کیا ھے۔ سلیم احمد ھمارے شعرو ادب اور تھذیب و تنقید کے ایک منفرد عالم ، شاعر اور ڈرامہ نگار تھے۔ اپنی ان حیثیتوں میں وہ برصغیر پاك و ھند کے تمام ادبی حلقوں میں معروف و مشھور تھے۔باقی جگھوں پر تو ان کا تعارف ایك نامور لکھنے والے کے طور پر تھا مگر اپنے قریبی حلقے والوں میں سلیم احمد ایك مکتب ، ایك مجلس اور محفل کا نام تھے۔ ان کی بیٹھك اپنوں اور غیروں کے لیے ایك مستقل ادبی حلقہ تھی جھاں وہ سراپا گفتگو رھتے۔ سلیم احمد جس طرح رواں تحریر کے بادشاہ تھے۔ اسی طرح دلنشیں مجلسی گفتگو کے بھی ماھر تھے۔ ان کی تحریر کی اھم ترین خصوصیت ان کا چونکا دینے والا انداز ھے۔ مربوط اور مدلل کلام اور سب سے بڑھ کر خوانگی (Readability)ان کی نثر کی بنیادی خصوصیت تھی۔ وہ پڑھنے والے کو اپنی بات اور استدلال کے بھاؤ میں بے دست پا کر دیتے تھے۔ ان سے اختلاف یا اتفاق قاری کو تب یاد آتا جب وہ اپنی بات مکمل کر لیتے ورنہ اثنائے کلام میں تو وہ ان کے سحر میں گرفتار سا ھو جاتا۔ جن لوگوں نے سلیم احمد کی چھپی ھوئی گفتگوئیں سنی پڑھیں ھیں وہ جانتے ھیں کہ تحریر کی طرح ان کے حسن گفتگو کا بھی نرالا عالم تھا۔ مربوط اور مدلل گفتگو اور مکالمہ کار کو مسحور کر دینے کا انداز ان پر ختم تھا۔ یہ نھیں کہ وہ مخاطب کو لازماً ھمنوا بنانا چاھتے تھے بلکہ ان کا اصل مقصد مخاطب کے ذھن کو سوچنے اور تجزیے کی طرف مائل کرنا ھوتا تھا۔

زیر نظر مکالمہ بھی سلیم احمد کے فنِ گفتگو کا ایك ایسا ھی دلنشین اور ذھن کی چولیں ھلانے والا نمونہ ھے۔ اس کا موضوع رومانیت اور بطور خاص اختر شیرانی کی رومانیت ھے۔ جن قارئین کی نظر میں سلیم احمد کا معروف مضمون "نئی نظم اور پورا آدمی" ھے وہ اس مکالمے میں زیر بحث مسئلے کو نوعیت فوری جان لیں گے۔ "نئی نظم اورپورا آدمی" کا بنیادی مقدمہ یہ تھا کہ ترقی پسند تحریك سے فوری قبل کا ادب رومان پرور اور جمال پرستی کی پینك میں جھول رھا تھا اور شاعری میں اس کا کامل اظھار اختر شیرانی کے ھاں ھوا تھا۔ سلیم احمد کے نزدیك "اختر شیرانی اردو شاعری کا پھلا رومانی شاعر" تھا۔ اس رومانیت کا سب سے بڑا مسئلے اس دور کے کچھ فنکاروں کے لجلجے جذبات اور حسن ، عشق ،عورت اور جنس کے بارے میں غیر حقیقی وماورائی قسم کے خیالات تھے جن کا

حقیقت کی دنیا سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اس دور کے شعر و نثر میں انسان کے مکمل وجود کا اظہار نہیں تھا۔ وہ تہذیبی اکائی جو ہماری روایتی کلاسیکی شاعری کی روح میں موجود تھی 'رومانیت' میں آگے ٹوٹ گئی اور اختر شیرانی جیسے شاعر کی معاشرے میں قبولیت اس امر کی شہادت تھی کہ یہ اکائی معاشرے میں بھی مکمل نہ رہی تھی۔ اختر شیرانی ایک ادھورا شاعر، "اوپر کے دھڑ کا شاعر" تھا۔" نئی نظم پورا آدمی" کا ابتدائی بڑا حصہ اختر شیرانی کی اسی تخییلی رومانیت کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ سلیم احمد نے اختر شیرانی کے اندر ٹوٹی اکائی ــــ نیچے کے دھڑ ــــــ کا کھوج ن م راشد اور میر اجی کے ہاں لگایا تھا۔ پورے آدمی کا یہ تصور ایک اعتبار سے سلیم احمد کا معیار ادب تھا، جس پر وہ ادب اور تہذیب کے جملہ مظاہر پرکھتے رہے تھے۔

"نئی نظم اورپورا آدمی" سلیم احمد نے ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا۔ اس میں ان کا موقف یعنی "ادھورے آدمی کا تصور" اتنا مختلف، تازہ، انوکھااور چونکا دینے والا تھا کہ اردو کی ادبی تنقید میں اس پر بحث سلیم احمد کے انتقال ۱۹۸۳ء تک ھوتی رہی تھی۔ زیر نظر مکالمے کا موضوع بھی اختر شیرانی کی رومانیت ہے جس پر سلیم احمد نے گفتگو کے پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ مکالمہ ان سے شبنم صدیقی نے کیا تھا۔شبنم صدیقی سلیم احمد کے میڑھ کے ملنے والوں میں سے تھے اور سلیم احمد کی وفات تک ان کے دوست رہے۔ وہ اندرون سندھ کے مختلف شہروں میں اردو کے استاد رہے اور گرمی کی چھٹیاں میں کراچی میں گزارتے۔ ۱۹۸۲ء کے بعد وہ مستقل کراچی آگئے اور سلیم احمد کی مجلسوں میں اکثر شریک رہتے۔ ان کے مطالعے کا دائرہ فلسفہ، مذہب اور ادب تک پھیلا ہوا تھا۔ اپنے اس علمی پس منظر کی وجہ سے وہ سلیم احمد کے سامنے کوئی نہ کوئی گھمبیر موضوع چھڑ دیتے اور گھنٹوں گفتگو جاری رہتی۔ زیر نظر مکالمہ ایک ایسی ہی گفتگو کی روداد ہے۔ شبنم صدیقی اور سلیم احمد کے مابین اس طرح کی بہت سی گفتگوئیں ہوئیں جن میں سے ایک جناب محمد سہیل عمر نے اپنے جریدے روایت، لاہور کے تیسرے شمارے، ۱۹۸۶ء میں "برگ سبز" کے عنوان سے شائع کی تھی اس کا موضوع مسئلہ تقدیر اور جبر و تقدر تھا۔ سلیم احمد کے انتقال کے بعد سہیل عمر نے ۱۹۸۶ء میں روایت کے دو ضخیم ستارے سلیم احمد کی یاد میں چھاپے تھے۔ سہیل عمر کے پاس اس سلسلے کی یہ دوسری گفتگو "شکست طلسم رومانیت یعنی گڈبائی ٹو اختر شیرانی" عرصہ ۲۸ برس سے رکھی ھوئی تھی۔ شروع میں ان کا خیال تھا کہ وہ اسے روایت کے شمارہ نمبر۶ میں شائع کریں گے مگر حالات ایسے رہے کہ روایت کا چھپنا ملتوی ہوتے ہوئے معطل ہوگیا اور اب طویل عرصے کے بعد بالآخر سہیل عمر صاحب نے یہ مسودہ خصوصی طور پر معیار میں اشاعت کے لیے ہمیں عنایت کر دیا اور اب ہم یہ نادر و نایاب گفتگو ان کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

یہ مسودہ شبنم صدیقی کا ھاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ بہت صاف اور عمدہ خط ہے جس میں مختلف رنگوں کے قلم استعمال کئے گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ سلیم احمد سے ان کی عقیدت اور محبت مسودہ لکھتے ہوئے بھی ان کے اندر پوری طرح موجزن رہی تھی۔ کاش ممکن ہو تا تو ہم ان کا سواد خط بھی تھوڑا سا دکھا سکتے۔ اس مسودے کے شروع میں چند تعارفتی سطور شمیم احمد مرحوم کی لکھی ہوئی ہیں۔ شمیم احمد سلیم احمد کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور انھی کی طرح شمشیربراں تھے۔ دونوں کے مزاجوں میں اختلاف بھی بہت تھا مگر کاٹ دار جملے لکھنے میں شمیم احمد سلیم احمد سے بھی دو ھاتھ آگے تھے۔ سلیم احمد نے اپنے اس چھوٹے بھائی کو باپ کی طرح پالا تھا۔ اسی لیے شمیم احمد انھیں کھتے تو" بھائی صاحب" تھے مگر ان کی عزت باپ کی طرح کرتے تھے۔ مگر جہاں ادبی اختلاف کی ضرورت محسوس ہوتی وہ سلیم احمد کا لحاظ بھی نہیں کرتے تھے۔ سلیم احمد نے جہاں اپنے موضوعات کو زیادہ تر شاعری تک محدود رکھا وھاں شمیم احمد کا قلم فکشن کی تنقید میں بھی فرائے بھرتا تھا۔ سلیم احمد کے انتقال کے بعد شمیم احمد نے ایک سوانحی ناول کا بھی ڈول ڈالا تھا۔ جو افسوس ان کے انتقال کے باعث ادھورا رہ گیا۔ اس ناول کا ابتدائی حصہ "بھائی صاحب" کے عنوان سے مکتب روایت لاہور سے ۱۹۹۱ء میں چھپ بھی گیا تھا۔

شمیم احمد نے اس مکالمے پر جو تعارفی کلمات لکھے ھیں ان کی اپنی اھمیت ھے اس لیے ھم وہ یھاں دے رھے ھیں:

شبنم صدیقی صاحب کا ایک مکالمہ روایت کے سلیم احمد نمبر میں شائع ھوچکا ھے۔ ھمیں بے حد مسرت ھے کہ انھوں نے ھماری فرمائش پر دوسرا مکالمہ بھی قلم بند کر لیا ھے جو پیش خدمت ھے۔ ایسے ھی چار اور موضوعات پر ان کے اور بھائی صاحب کے درمیان جو گفتگو ھوئی تھی، انشاء اللہ اسے بھی وہ جلد کاغذ پر منتقل کر دیں گے۔

زیر نظر مکالمے اور روایت سلیم احمد نمبرکے سابقہ مکالمے کو بھائی صاحب کے جن اعزہ اور احباب نے سنا ھے وہ سب اس بات پر متفق ھیں کہ شبنم صدیقی صاحب نے کمال صحت کے ساتھ نہ صرف سلیم احمد کے خیالات، انداز فکر اور لب و لھجے کو کاغذ پر منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کی ھے بلکہ اس سے ان کی "حیرت انگیز یادداشت"، ان کے اھم سوالات اور اس کے لیے ان کی پھلے سے "ذھنی تیاری کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ھے۔ میں شبنم صدیقی صاحب کی اس انوکھی صلاحیت پر میرؔ کے الفاظ میں انھیں یھی داد دے سکتا ھوں:

مرا حرف رشک کتاب ھے

مری بات لکھنے کا باب ھے

شمیم احمد

تعارفیے میں شمیم احمد نے لکھا کہ "ایسے ھی چار اور موضوعات پر ان کے اور بھائی صاحب کے درمیان" گفتگو ھوئی۔ گویا روایت کے "برگ سبز" اور "گڈبائی ٹو اختر شیرانی" والے ان دو مکالموں کے علاوہ چار اور موضوعات پر ابھی اور بھی غیر شائع شدہ گفتگو موجود ھیں۔ ھم کوشش کریں گے کہ ان گفتگوئوں کو تلاش کرکے شائع کیا جائے۔ اب ایک آدھ کلمہ موجود مکالمے، میں سلیم احمد کے اسلوب استدلال کے بارے میں :قارئین ملاحظہ کریں گے کہ سلیم احمد کے استدلال کا طریقہ یہ ھے کہ وہ مسائل کا جواب دیتے ھوئے بڑی مھارت سے سوال کرنے والے ھی کے منہ سے اپنا موقف ادا کروا کر اپنی بات واضح کرتے ھیں اور جب محسوس کرتے ھیں سائل کا رومانی لھجہ خود اس کے مقدمے کو کمزور کر رھا ھے جس کا شاید اسے احساس بھی نھیں تو وہ خود اسے روک کر اس جانب متوجہ بھی کرتے ھیں کہ "خود اپنا مقدمہ کمزور نہ کرو"۔ شبنم صدیقی اپنے سوالوں میں جس طرح اختر شیرانی کے اشعار و لفظیات استعمال کر رھے ھیں وہ تو سمجھ میں آتا ھے کہ وہ مسئلہ زیر بحث پر خوب تیاری کرکے آئے ھیں، خود سلیم احمد بھی اختر شیرانی کی نظموں کو فی البدیہ اپنے موقف کی شھادت میں استعمال کر رھے ھیں، یہ حیرت انگیز ھے اور پتہ دیتا ھے کہ اختر شیرانی ان کے اندر بھی کس درجہ اترا ھوا ھے۔شبنم صدیقی نے اس مکالمے کا عنوان بجا طور پر "گڈبائی ٹو اختر شیرانی" رکھا ھے۔ یہ ایک تو اختر شیرانی کے طرز کی شاعری کے "پرانے پن" کی طرف اشارہ ھے دوسرے یہ عنوان خود سلیم احمد کے مزاج کی عکاسی بھی کرتا ھے۔ وہ خود بھی اس طرح کا ایک عنوان "گڈبائی ٹو سرسید" اپنے ایک مضمون کے لیے لکھ چکے تھے۔

سلیم احمد کا انتقال ۳۱/اگست ۱۹۸۳ءکو ھوا تھا۔ یہ مکالمہ اگر اسی سال کا ھے تب بھی آج یہ ۳۲ برس پرانا ھے۔ ادارہ معیار یہ ۳۲ برس پرانی تحریر شائع کرتے ھوئے فخر محسوس کرتا ھے اور محمد سھل عمر سابق ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی کا ممنون ھے کہ انھوں نے یہ نادر مسودہ اشاعت کے لیے ھمیں ارزانی کیا۔

مدیر

(عزیز ابن الحسن)

سلیم احمد: کہو شبنم! آج کیا مقدمہ لے کر آئے ہو؟

شبنم صدیقی: آج کوئی مقدمہ لے کر نہیں آیا، آپ پر دو مقدمے دائر کرکے آیا ہوں: ایک تو اس بات پر کہ آپ نے (اپنے مضمون) ''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں شاعر رومان اختر شیرانی کی شاعری کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ اسے ایک کڑوا اور بدمزہ گھونٹ سمجھ کر تاریخ کی گندی نالی میں تھوک دیا جائے گا، یعنی آپ نے اختر شیرانی کی رومانی شاعری کو ابدیت کے جوہر سے عاری قرار دے دیا۔

دوسرا مقدمہ اس بات پر دائر کیا گیا ہے کہ آپ نے ''پورے آدمی'' یا ''پوری عورت'' اور اس کے نتیجے میں پوری محبت کے تصور کو ایک ادبی معیار بنا کر متعدد شعراء کی شاعرانہ قدر و قیمت کو پرکھا۔ گویا آپ نے ترقی پسند دانشوروں کی طرح ادب کو غیر ادبی معیاروں سے جانچا۔ پھر آپ میں اور ترقی پسند دانشوروں میں کیا فرق رہ گیا؟

سلیم احمد: شبنم! تمہارے دوسرے مقدمے پر تو میں ابھی بات کروں گا۔ ذرا پہلے مقدمے پر بات ہو جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اختر شیرانی سے اب بھی اتنے ہی مسحور اور متاثر ہو جتنے کسی زمانے میں تھے یا پھر یہ تمہارا Nostalgia ہے جو بار بار تمہارا پیچھا کرتا ہے اور تمہیں بڑی شدت سے اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ تمہاری اصل تو اختر شیرانی اور اس کی رومانیت تھی، یہ تم کہاں آ گئے!

بات تو شبنم، پرانی ہوگئی مگر ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا یہ صحیح ہے کہ تم کو کسی نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تم اختر شیرانی کو اپنے اعصاب پر سوار کرنا چھوڑ دو تو اچھے شاعر بن جاؤ گے؟

شبنم صدیقی: جی ہاں سلیم بھائی! یہ غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب ''ادب لطیف'' کا ''اردو نمبر'' شائع ہوا تھا۔ اس میں جمیل ملک نے میری شاعری کا ذکر کرتے ہوئے مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر میں اختر شیرانی کو اپنے اعصاب پر سوار کرنا چھوڑ دوں تو اچھا نظم گو اور غزل گو شاعر بن سکتا ہوں...... مگر آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟

سلیم احمد: اس لیے کہ اسی سوال در سوال اور جواب در جواب میں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا۔ خیر، تو یہ بتاؤ کہ کیا تم نے موصوف کے اس مشورے پر عمل کیا؟

شبنم صدیقی: میں نے، سلیم بھائی! شعوری طور پر تو اس مشورے پر دھیان نہیں دیا اور نہ اس پر عمل کیا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ میرا ذہنی اور شعری افق خود بخود وسیع ہوتا گیا۔ میں نے زندگی کے دوسرے تجربات کا مزہ بھی چکھا، تخیل اور احساس کی نئی دنیاؤں میں بھی سفر کیا۔ بہت سے دوسرے شعراء کے شعری اسالیب سے بھی اثر قبول کیا۔ شعریت کے نئے نئے Patterns سے بھی آشنا ہوا۔ تنقیدی شعور اور بصیرت حیات کی کارفرمائیوں کو بھی محسوس کیا اور یہ تمام تبدیلیاں از خود نمودار ہوتی رہیں۔

سلیم احمد: گویا تمہارے ذاتی تخلیقی تجربے نے اس بات کی تصدیق کر دی اور تم نے غیر شعوری طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اختر شیرانی کی رومانیت کا طلسم پائدار نہیں ہے۔ عمر کے ایک خاص حصے میں اس کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے مگر عمر گزراں کے ساتھ ساتھ اس کے کیمیائی جلوے معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

تو کیا اسی عارضی طلسم کے بارے میں تم یہ کہہ رہے تھے کہ میں نے اسے ابدیت کے جوہر سے عاری قرار دے دیا ہے؟ اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو!

شبنم صدیقی: سلیم بھائی اردو رومانوی شاعری کی ابدیت کے بارے میں میرا موقف کچھ اور ہے۔

عنوان: اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ عنفوان شباب کا وہ دور جس میں کائنات رنگین نظر آتی ہے، زندگی کے مظاہر نہایت حسین معلوم ہوتے ہیں، فطرت کے مناظر شراب وشعر کی تفسیر دل نشیں محسوس ہوتے ہیں، نغمے روح کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں، ماضی کی یادیں دل کو بے تاب کر دیتی ہیں، مستقبل کے خواب جنت نگاہ بن جاتے ہیں، چاندی راتیں اور ساون کی گھنگھور گھٹائیں سازِ دل کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہیں، محبوبہ شبستان جوانی کا زندہ ستارہ، رباب حسن کا الہامی ترانہ، پرستان لطافت کی رنگین کہانی اور جواں فطرت کا گم شدہ خواب جوانی معلوم ہوتی ہے، وہ دور...... ہاں وہی دور...... بہت عارضی ہوتا ہ اور یہ تمام محسوسات بھی عارضی ہوتے ہیں۔ زندگی کے سنگین حقائق کی دھوپ پڑتے ہی شبنم کی طرح اُڑ جاتے ہیں...... ہاں شبنم کی طرح......

سلیم احمد: ٹھہر جاؤ شبنم! تمہارا Nostalgia پھر پوری شدت سے ابھر آیا ہے۔ اسے روکو۔ یہ تمہارے مقدمے کو کمزور کر دے گا۔ میرا اندیشہ صحیح تھا کہ یہ بار بار تمہارا پیچھا کرتا ہے، تم سے پوچھتا ہے کہ اختر الایمان تم ہی ہو! بھول جاؤ اس لڑکے کو، یہ تمہیں تمہارا ماضی یاد دلاتا ہے اور تمہاری غور وفکر کی صلاحیت کو سلب کر لیتا ہے...... ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟

شبنم صدیقی: میں یہ کہہ رہا تھا سلیم بھائی کہ یہ دور عارضی تو ہوتا ہے، مگر ایک فرد انسانی ہی کی زندگی میں تو عارضی ہوتا ہے نا، بنی نوعِ انسان کے مجموعی عرصہ حیات میں تو عارضی نہیں ہوتا! ماضی کا انسان بھی عمر کے ایک خاص حصے میں محبوبہ کو رباب محبت کا الہامی ترانہ محسوس کرتا تھا، آج کا انسان بھی عنفوان شباب میں اسے پرستان لطافت کی رنگین کہانی سمجھتا ہے، اور مستقبل کا انسان بھی اس عرصہ عمر میں اسے جواں فطرت کا ایک کھویا ہوا خواب جوانی محسوس کرتا رہے گا۔ تو کیا یہ ہوش ربا اور نور افشاں طلسمی دور جو ایک انسان کی زندگی میں کتنا ہی عارضی سہی! ماضی حال اور مستقبل کے تمام انسانوں کا مشترک ابدی ورثہ نہیں ہے؟ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام انسانوں کا مشترک سرمایہ نہیں ہے؟ تو پھر جو شاعری انسانیت کے اس ابدی ورثے یعنی عمر انسانی کے اس طلسمی دور کی کیفیات اور محسوسات کو زبان عطا کر دے، ایک طلسم آفریں شاعرانہ قوت کے ساتھ اس کی ترجمانی کر دے کیا اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کوئی ابدیت نہیں اور اسے ایک تلخ اور بدمزہ گھونٹ سمجھ کر تاریخ کی گندی نالی میں تھوک دیا جائے گا؟

سلیم احمد: ابدیت کے بارے میں شبنم! تمہیں اپنے خیالات کو ذرا تبدیل کرنا پڑے گا۔ ابدیت صرف کسی چیز کے ماضی حال اور مستقبل میں موجود رہنے کا نام نہیں ہے۔ ابدیت کا تعین اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اس چیز کی قدر وقیمت کیا ہے۔ تم نے چونکہ ابدیت کی بات صرف رومانی شاعری کے حوالے سے کی ہے، اس لیے رومانی شاعری تک محدود رہتے ہوئے میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ رومانی شاعری صرف اختر شیرانی نے نہیں کی، دنیا کی بہت سی زبانوں میں

بہت سے شاعروں نے کی ہے، اور ان میں متعدد شعراء ایسے ہیں جن کی رومانی شاعری میں صرف رومانیت نہیں عظمت بھی ہے۔ وہ عظمت جس کے بغیر ابدیت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیٹس، شیلے اور، بائرن بھی رومانی شاعر تھے۔ کیا ان کے ہاں صرف رومانیت ہے؟ ذرا ان کی رومانی نظموں کو اختر شیرانی کی نظموں کے تقابل میں رکھ کر دیکھو۔ کیا کلیم الدین احمد کا یہ سوال غلط تھا کہ'' کیا اختر شیرانی کی کوئی نظم کیٹس کی Ode to a nightingale کا مقابلہ کرسکتی ہے''؟

میری اس ایک بات سے شبنم! مجھے مغرب زدہ نہ سمجھ لینا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں ''مغرب زدگی'' کے خلاف کتنا جہاد کرتا رہا ہوں۔ تمہارے اطمینان کے لیے میں اقبال کی مثال پیش کرتا ہوں۔ ذرا اقبال کی ان رومانی نظموں کی جو انہوں نے قیام یورپ کے دوران لکھی تھیں، اختر شیرانی کی رومانی نظموں کے تقابل میں رکھ کر دیکھو، کچے اور پکے ذہن کا فرق واضح ہو جائے گا۔

ع جس طرح رفعت شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوئے غم سے

ذرا ایسا کوئی شعر یا جس نظم کا یہ آخری شعر ہے ویسی کوئی نظم اختر شیرانی کی رومانی شاعری کے ذخیرے میں سے نکال کر دکھا دو۔

دیکھو شبنم! ''طلسم'' عظمت اور ابدیت کا ضامن نہیں ہوتا۔ اگر طلسم ہی کائنات کی سب سے قیمتی چیز ہوتی تو فرعون کے جادوگر دنیا کے سب سے عظیم انسان ہوتے، عصائے کلیمی کے معجزے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ شاعری یا رومانی شاعری کی ابدیت عمر انسانی کے طلسمی دور کی ترجمانی سے متعین نہیں ہوتی، چاہے وہ ماضی حال اور مستقبل کے تمام انسانوں کا مشترک ورثہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ابدیت شاعرانہ اظہار کے طلسم آفریں تاثر سے بھی متعین نہیں ہوتی۔ شاعری کی ابدیت کا تعین شاعر کے ''احساس خود آ گاہی'' کی شدت سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ماضی حال اور مستقبل کے تمام عظیم انسانوں کا سب سے بیش قیمت ورثہ ''ذوقِ خود آ گاہی'' ہے۔

''تاریخ کی گندی نالی'' کے الفاظ پر رنجیدہ نہ ہو شبنم! گندی نالی میں صرف وہی چیز نہیں پھینکی جاتی جو گندی ہو۔ ہر وہ چیز جس کی افادیت اور قدر و قیمت مستقل نہ ہو، گندی نالی میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس سے اس چیز کا وجود بے معنی نہیں ہو جاتا اور نہ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کی ماضی میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ کاغذ کے جس پرزے کی قدر و قیمت دائمی ہوتی ہے اسے کبھی گندی نالی میں نہیں ڈالا جاتا۔ ہاں جس کی قدر و قیمت ایک عارضی دور کے بعد ختم ہو جاتی ہے اسے گندی نالی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ عارضی قدر و قیمت رکھنے والی چیزیں ماضی کے انسانوں کے پاس بھی ہوتی تھیں، حال کے انسانوں کے پاس بھی ہوتی ہیں اور مستقبل کے انسانوں کے پاس بھی ہوں گی۔ لیکن صرف اس دلیل کی بنا پر انہیں ابدیت جیسی صفت سے متصف نہیں کیا جاسکتا۔ خود گندی نالی بھی ہر زمانے میں ہوتی ہے۔ اس کا وجود ماضی میں بھی تھا، حال میں بھی ہے اور مستقبل میں بھی ہوگا۔ لیکن اس سے گندی نالی کا شمار دنیا کے عظیم اور ابدی تہذیبی سرمائے میں نہیں کیا جاسکتا۔

ابدیت قدر و قیمت سے پیدا ہوتی ہے، عظمت کی گود میں پرورش پاتی ہے۔ اور عظمت اس خود آ گہی سے جنم لیتی ہے جس کے آس پاس جھوٹی انا کا گزر نہیں ہوسکتا۔

شبنم صدیقی: ہاں ''جھوٹی انا'' سے مجھے یاد آیا، سلیم بھائی، کہ آپ نے رومانیت کو جھوٹی انا کی تبلیس قرار دیا ہے بلکہ ''نئی نظم اور پورا آدمی'' کا بنیادی Thesis یہی ہے کہ جس چیز کو رومانیت کہا جاتا ہے وہ جھوٹی انا سے پیدا ہوتی ہے اور وہ رومانیت کی مصنوعی آب و تاب میں اپنا جلوہ برابر دکھاتی رہتی ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اختر شیرانی کی رومانی شاعری میں آپ کو شدت احساس اور والہانہ پن کا جوہر کہیں نظر نہیں آیا اور اگر اختر شیرانی کے ہاں والہانہ پن ہے تو کیا وہ جھوٹی انا کی مصنوعی کارفرمائیوں سے پیدا ہوسکتا ہے؟

سلیم احمد: اس کی تشریح میں اس مقالے میں بھی کر چکا ہوں اور وقتاً فوقتاً اپنی گفتگو میں بھی کرتا رہتا ہوں۔ تمہارے اس سوال کا مختصر ترین جواب میں اختر شیرانی کے کچھ اشعار کے حوالے سے دینا چاہتا ہوں۔ ذرا غور سے سنو!

ع
میں وہ میکش ہوں کہ گلزار جناں سے صبح و شام
حوریں آتی ہیں مجھے کوثر پلانے کے لیے

....

میں وہ مجنوں ہوں کہ گر یہ جنوں منظور ہو
دشت میں آجائے لیلیٰ خاک اڑانے کے لیے

....

میں وہ وامق ہوں کہ ذوق بندگی ہو گر قبول
میرے در پر آئے عذرا سر جھکانے کے لیے

....

میں وہ خسرو ہوں کہ گر چاہوں ثبوت عاشقی
مضطرب شیریں ہو جوئے شیر لانے کے لیے

اور ہاں ...... وہ کیا کہا ہے ...... اسی سلسلے میں ...... ہاں سنو!

ع
خاک و خاکستر نشینی گر مجھے منظور ہو
جنتیں لے آئیں پھول اپنے بچھانے کے لیے

....

میرے سینے میں ہیں وہ احساس کے شعلے پنہاں
مہرومہ ہیں مضطرب جن میں نہانے کے لیے

تم دیکھ رہے ہو شبنم! احساس کے شعلے کی شدت اور تمازت کا تاثر اتنا نہیں ابھرتا جتنا اس بات کا کہ مہرومہ اس میں نہانے

کے لیے مضطرب ہیں۔ اس لیے کہ وہ شاعر رومان جیسی محبوب صفت ہستی کے سینے میں فروزاں ہے۔ کیا کروفر ہے اس صاحب احساس شاعر کا! جنت کی حوریں کوثر پلانے چلی آ رہی ہیں، لیلیٰ خاک اڑانے کے لیے بھاگی آ رہی ہے، عذرا اس کے در پر سر جھکانے آ رہی ہے، شیریں جوئے شیر لانے کے لیے مضطرب ہے۔ جنتیں اس کے درویشی بستر پر بچھانے کے لیے اپنے پھول لا رہی ہیں۔ بتاؤ شبنم اپنی شدت احساس اور والہانہ پن کے اظہار کی بنیاد کس بلا کی انا پرستی پر رکھی جا رہی ہے!

دیکھ شبنم! رومانیت اور اس کے تمام پہلوؤں کا معنوی جوہر کیا ہے، Remoteness ہی تو ہے۔ یہ دوری کا احساس چاہے ماضی کی یادوں میں کارفرما ہو، مستقبل کے خوابوں میں جلوہ نما ہو، حسن مثالی کی خیالی بہشتوں میں تجلی فگن ہو، حقیقی زندگی اور معاشرے کے سنگین اور بے رحم حقائق سے فرار کی صورت میں تشکیل پائے تو اسی احساس کا عکس نہیں ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جو دوسرے ہیں میں دوسروں سے بلند و بالا ہوں ۔ جن اشیاء سے دوسروں کو دلچسپی ہے ان سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں۔ میں نادر روزگار ہوں، میں جنس نایاب ہوں۔ میں دانائے راز ہوں۔ مجھ ایسی مضطرب روح اور بے قرار دل رکھنے والا کوئی اور نہیں۔ اے دنیا والو! میں تم سے کوئی رابطہ رکھنا اپنی عظمت کے منافی سمجھتا ہوں، لیکن تم پر لازم ہے کہ مجھ سے محبت کرو۔ میری قدر کرو بلکہ میری پرستش کرو۔

یہ ہے رومانیت کا جوہر جو درحقیقت فرد پرستی کے مسلک فکر کی پیداوار ہے۔ فرد پرستی ایک زہریلا درخت ہے جس کا کڑوا اور زہریلا پھل رومانیت ہے۔ یہی فرد پرستی رومانی شاعری میں جھوٹی انا کا زہر گھولتی رہتی ہے، سچے احساس کے چشمہ صافی کو ناپاک کرتی رہتی ہے۔ جسے آگہی کے سمندر میں گرنا چاہیے اس دریا کو تاریخ کی گندی نالی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ رومانیت ایک بہت خوبصورت سانپ ہے مگر جتنا خوبصورت اتنا ہی زہریلا۔

شبنم صدیقی: سلیم بھائی! میرا سوال یہ ہے کہ کیا وہ انانیت جسے آپ رومانیت کا سرچشمہ قرار دے رہے ہیں......

سلیم احمد: ٹھہرو شبنم! انانیت کو رومانیت کا سرچشمہ میں نہیں خود اختر شیرانی قرار دے رہا ہے۔ دیکھو اپنے اس سانیٹ میں جس کا عنوان ہی انانیت ہے، وہ انانیت کی زبان سے کیا کہلوا رہا ہے۔

ے
حد آخر میری طلعت آسماں کی شکل میں
عظمتوں سے کھیلتی ہوں کہکشاں کی شکل میں
خندہ زن ہوں بزم خاکی پرستاروں کی طرح
رعد کی صورت گرجتی ہوں بساط خاک پر
ہیں قدم میرے زمین پر سر مرا افلاک پر
صورت اندیشہ مستی میں بھپر جاتی ہوں میں
پردہ ہائے ماہ وانجم سے گزر جاتی ہوں میں

اب بتاؤ شبنم کیا میرا تجزیہ خود ساختہ مفروضات پر مبنی تھا۔ انانیت کی طلعت نمودار ہوتی ہے تو آسمان کی شکل میں وہ عظمتوں سے کھیلتی ہے تو کہکشاں کی شکل ہیں۔ وہ ارضی دنیا کو حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ بزم خاکی پر خندہ زن ہوتی ہے تو ستاروں کی

طرح۔ اس کے قدم زمین پر ضرور ہیں مگر اس کا سر افلاک پر ہے۔ کیوں نہ ہو، دماغ جو آسمان پر ہے۔ اور اس کے سفر کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ وہ پردہ ہائے ماہ انجم سے گزر جاتی ہے۔ یہ طلعت آسمانی، یہ کہکشاں کی بساط نور، یہ ستاروں کا خندہ دنداں نما، یہ پردہ ہائے ماہ وانجم اور یہ سیر افلاک کس چیز کی علامتیں ہیں؟ کیا اسی Remotenessاور اسی احساس جمال کی نہیں جسے رومانیت سے وابستہ کیا جاتا ہے؟...... ہاں تو تمہارا سوال کیا تھا؟

شبنم صدیقی: سوال سلیم بھائی میرا یہ تھا کہ کیا ایک رومانی شاعر کی انانیت اس کی لطافت احساس کے بغیر رومانیت کے پیکر میں ڈھل سکتی ہے؟ کیا لطافت احساس کا کوئیIndependentوجود نہیں؟ کیا وہ ایک مستقل بالذات شے نہیں؟ کیا ایک رومانی شاعر کی انانیت کا اثبات اس کی لطافت احساس کی نفی کر دیتا ہے؟ کیا لطافت احساس کے بغیر رومانی شاعری وجود میں آسکتی ہے؟ کیا انانیت تن تنہا رومانی شاعری کی جنم دے سکتی ہے؟ کیا رومانی شاعری میں انانیت لطافت احساس کی خالق ہے یا اس کی شریک کار؟

آپ کی گفتگو سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ کہ لطافت احساس بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ صرف انانیت کا ایک پر فریب مظہر ہے۔ اور یہ انانیت بھی رومانی شاعر کا کوئی ذاتی یا انفرادی تجربہ نہیں ہے بلکہ یہ اس مسلک فکر کی پیداوار ہے جسے فکر انسانی کی تاریخ میں فرد پرستی یاIndividualism کہا جاتا ہے۔

آپ کے اسی قسم کے خیالات سے جدید نسل کے خود ساختہ دانشوروں میں یہ جسارت پیدا ہوئی ہے کہ وہ اختر شیرانی کا مطالعہ کیے بغیر بے تکلف اس کی شاعری کو Pseudo-poetryاور اس کی رومانیت کو Psudo-Romanticisism کہہ دیتے ہیں۔ میں ان سے بہت سے لوگوں کے بارے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ انہوں نے اختر شیرانی یا کسی رومانی شاعر کی ایک نظم کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا، نہ انہیں یہ معلوم ہے کہ Romanticism کیا چیز ہے۔ ان کے کانوں میں ’’نئی نظم اور پورا آدمی‘‘ کے چند جملے پڑ گئے ہیں اور انہوں نے کہیں یہ سن لیا ہے کہ اختر شیرانی ایک شاعر تھا۔ جس نے ’سلمیٰ‘ اور ’عذرا‘ کا نام لے لے کر نظمیں کہی تھیں اور اس مبلغ علم کی بنیاد پر وہ اختر شیرانی کی رومانیت کوPseudo-Pomaticism کہتے نہیں تھکتے۔ اور اپنیPseudo-Intellectulism سے بالکل بے خبر ہیں۔

میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا ایک انسان کی انانیت اس کی زندگی کے اسی دور میں اپنے نقطہ عروج پر نہیں ہوتی جسے عنفوان شباب کہا جاتا ہے؟ اور کیا یہی زمانہ انسان کی لطافت احساس کی معراج کمال کا نہیں ہوتا؟ اب اگر ایک رومانی شاعر کی شاعری میں جو بہرحال عنفوان شباب کے دور کی پیداوار ہوتی ہے، انانیت اور لطافت احساس شانہ بہ شانہ چلتی ہیں تو اسے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا جاسکتا کہ اس کی لطافت احساس اس کی انانیت کی آلہ کار ہے یا اس کے برعکس اس کی انانیت اس کی لطافت احساس کی پیداوار ہے۔

بتایئے سلیم بھائی کہ ہم کیوں اس کی لطافت احساس کو اس کی انانیت کا آلہ کار سمجھیں! کیوں نہ ہم اسے اس کے عہد شباب کا ایک عطیہ خداوندی سمجھیں؟ اور اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیوں ہم اس کی انانیت کے ڈانڈے فرد پرستی کے مسلک فکر سے ملائیں؟ کیوں نہ ہم اسے اس کے جوش شباب کا مظہر قرار دیں؟

سلیم احمد: شبنم! Pseduo-Intellectuals کو تو گولی مارو۔ وہ بیچتے کیا ہیں؟ میں نے ''نئی نظم اور پورا آدمی'' ان لوگوں کے لیے نہیں لکھی تھی۔ میں نے تو یہ پوری کتاب تم جیسے صاحب احساس لوگوں کی قوت فکر کی متحرک کرنے کے لیے لکھی تھی جو اس موضوع پر سوالات کرتے مجھے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں۔

اب تم بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے۔ میں نے تو نہ صرف اختر شیرانی بلکہ اس سے Inspire ہونے والے تمام رومانی شاعروں کی ایک ایک نظم کا پوری سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ میں Romanticism اور Romantic Movement سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ میرے کسی مضمون کے چند جملے سن کر اگر کچھ نام نہاد دانشوروں نے کچھ مفروضے قائم کر لیے اور ان مفروضات کو مسلمات کی طرح ماننے لگے تو وہ اپنی موت آپ مرجائیں گے۔

دیکھو شبنم! لطافت احساس بے شک عہد شباب کا ایک عطیہ خداوندی ہے اور اپنا ایک قائم بالذات وجود رکھتی ہے۔ اور لطافت احساس کا اظہار بے شک ایک Genuine فنکارانہ عمل ہے، مگر لطافت احساس کے اظہار اور لطافت احساس کی نمائش میں فرق ہوتا ہے۔ لطافت احساس کا اظہار کرنا اور بات ہے اور لطافت احساس کو جتانا اور چیز ہے۔ لطافت احساس کا اظہار، دنیا کے تمام بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی عظیم تخلیقات میں موجود ہے، مگر وہاں اس کی نمود بالکل اسی صورت میں ہوتی ہے جیسے بادل چھائے ہوئے ہوں اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک اٹھتی ہو۔ اب اگر صورت حال یہ ہو کہ بادلوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلسل بلا وقفہ بجلی چمکتی رہے تو کم ازکم مجھے اس منظر میں کوئی حسن محسوس نہیں ہوگا۔ لطافت احساس کا اظہار Flashes کی صورت میں ہونا چاہیے، خالص جمالیاتی ادب عظیم ادب نہیں ہوتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اختر شیرانی میں سچی لطافت احساس نہیں تھی اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ اختر شیرانی کی شاعری میں لطافت احساس کا genuine کا اظہار کہیں نہیں ہوا۔ مگر شبنم تم اتنا تو سمجھ سکتے ہو کہ اگر تمہارا کوئی دوست مسلسل آٹھوں پہر نور نکہت اور رنگ، ماضی کی یادوں، چاندنی راتوں بھری برساتوں، گھنگھور گھٹاؤں اور سلماؤں اور عذراروں کی باتیں کرتا رہے تو کیا تم یہ سوچنے پر مجبور نہیں ہو جاؤ گے کہ وہ شخص اپنی لطافت احساس اور اپنے ذوق جمال کا سکہ جما کر تم کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟ اور کیا تم اس کی باتوں میں ایک مخفی تصنع کی جھلک محسوس نہیں کرو گے؟ اور کیا تم اس کی اس رنگین بیانی سے بہت جلد اکتا نہیں جاؤ گے؟ مجھے بتاؤ کہ تم اس کے ساتھ کتنے دن گزارا کرسکو گے۔

رہ گیا تمہارا یہ سوال کہ ہم ایک رومانی شاعر کی انانیت کے ڈانڈے فرد پرستی کے مسلک فکر سے کیوں ملائیں اسے اسکے جوش شباب کا مظہر کیوں نہ قرار دیں تو اس کے جواب میں میں تم سے یہ کہوں گا کہ تم اردو ادب کے ایک بہت سنجیدہ طالب علم رہے ہو، کیا تمہیں اتنی سی بات نہیں معلوم کہ اختر شیرانی کی شاعری کی ابتداء اور عروج کا زمانہ وہ زمانہ ہے جسے اردو ادب کی تاریخ میں انشائے لطیف کا دور کہا جاتا ہے؟ اس دور میں بہت سے ادیبوں نے انشائے لطیف کے نمونے تخلیق کیے اور بہت سے شاعروں نے رومانی نظمیں لکھیں۔ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کے ہاں رومانی انانیت ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کیا اس دور سے پہلے کے ادیب اور شاعر کبھی جوان نہیں ہوا کرتے تھے؟ کیا ان کو کبھی جوش شباب کی دولت میں سے کوئی حصہ نہیں ملا تھا؟ اگر یہ انانیت صرف جوش شباب کا مظہر تھی تو اس دور سے پہلے کے ادیبوں اور شاعروں کے ہاں یہ انانیت اس رومانی آن بان کے ساتھ کیوں

نہیں ملتی؟ حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے پورے اردو ادب پر فرد پرستی کے مسلک فکر کا بہت گہرا Impact تھا اور یہ ایک بہت تفصیل طالب موضوع ہے۔

اب اختر شیرانی کی رومانی انانیت اگر اس کے دور کے اس مخصوص رجحان کے زیر اثر نہ ہوتی تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس کا فرد پرستی کے مسلک فکر سے کوئی تعلق نہیں اور وہ صرف اس جوش شباب کا مظہر ہے جس کا تجربہ ہر انسان کو عمر کے اس حصے میں ہوتا ہے، لیکن جیسا کہ تم نے دیکھا صورتِ حال یہ نہیں ہے۔ اس لیے اختر شیرانی کی رومانی انانیت کے ڈانڈے بہر حال فرد پرستی کے مسلک فکر سے ملائے جائیں گے اور اس کے بغیر اس کی ماہیت اور اس کی اصل نوعیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

شبنم صدیقی: سلیم بھائی آپ نے ابھی اختر شیرانی کے ایک سانیٹ کے حوالے سے آسمان اور کہکشاں اور ستاروں اور پردہ ہائے ماہ و انجم کی بات کی تھی جس سے اس تصور کو تقویت پہنچتی ہے کہ اختر شیرانی کی رومانیت صرف سماوی حسن سے علاقہ رکھتی ہے، ارضی حسن سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ ''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں بھی آپ کا موقف یہی ہے کہ رومانی شاعر اپنی محبوبہ کو ایک ماورائی وجود بنا کر پیش کرنا چاہتا ہے اور اس کو ایک ارضی وجود بنا کر پیش کرنے سے جھجکتا اور شرماتا ہے، اور یہ کہ رومانی شاعر کی محبت بھی ایک ماورائی محبت ہے، ارضی نہیں۔

میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ شاعر رومان کی محبوبہ اگر ایک طرف بہار حسن کا غنچہ شاداب ہے اس سنسار کا ایک آسمانی خواب ہے، جہان قدس کا ایک فردوسی افسانہ ہے، مصر جمال و ناز کی ایک ساحرہ ہے، صنم آباد عفت کی مقدس کا مزہ ہے۔ پری و حور کی تصویر نازنین ہے، بہار وخواب کی تنویر مرمریں ہے، شراب و شعر کی تفسیر دل نشین ے، اس کا جسم نازنین سراپائے خیال حور ہے، اس کا روئے حسین مجسم خندہ خواب پری ہے، اس کا عکس دل نشیں چمن زار شعاع نور ہے۔

......تو دوسری طرف وہ ایک ارضی مخلوق بھی ہے۔ وہ سلمیٰ بن کر کبھی نور جہاں کے مزار پر آتی ہے تو کبھی بستی کی لڑکیوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ریحانہ بن کر صحراؤں میں اپنے گلے کو چراتی اور وادی کے چشموں پر منہ دھوتی نظر آتی ہے۔ کبھی اس کا حسن خراماں دامنِ لارنس کے خوابیدہ پھولوں کے آس پاس نظر آتا ہے۔ اس کا اظہار عشق بہت دنوں تک شاعر کے کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔ اس کے بے تاب آنسو اس کے رنج وغم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ چاند کی کرنوں سے گھبرا کر خلوت تلاش کرتی ہے اور پھر خلوت میں ہم آغوشی کی پنہاں کوششیں بھی کرتی ہے۔ مینہ برستے میں اپنے پرستار شاعر کو بیاباں کی طرف بھی لے جاتی ہے اور اگر اس محبوبہ کو صرف عورت کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کے کتنے رنگا رنگ ارضی روپ ''نغمہ حرم'' کی نظموں میں مل جاتے ہیں جن میں عورت ایک ماں، ایک بیوی، ایک سہیلی اور ایک ہجولی کے روپ میں نظر آتی ہے۔ تو جب صورت حال یہ ہے تو اختر شیرانی کی شاعری میں حسن، عشق، محبوبہ اور عورت کا تصور صرف سماوی اور ماورائی قرار دے دینے کا آپ کے پاس کیا جواز ہے؟

سلیم احمد: شبنم! ''نغمہ حرم'' کی تو بات نہ کرو۔ خود اختر شیرانی نے ''صبح بہار'' کے دیباچے میں اس مجموعے کو بعض نظموں کے سوا لائق اعتبار قرار نہیں دیا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ یہ مجموعہ اختر شیرانی کی انفرادیت کا ترجمان نہیں ہے۔ سوائے ایک نظم ''جوگن'' کے اس مجموعے کی نظمیں وہ نظمیں نہیں ہیں جنھوں نے اختر شیرانی کو اختر شیرانی بنایا۔ تم خود سوچو

شبنم کہ اگر اختر شیرانی صرف ''نغمہ حرم'' اور ''پھولوں کے گیت'' لکھ کر مر جاتا تو کیا ہم اور تم اختر شیرانی کو نادر کا کوروی اور سرور جہان آبادی کی طرح ایک دو نظموں کے شاعر کے سوا کسی اور حیثیت سے پہچانتے!

تمہاری بنیادی غلطی یہ ہے کہ تم اختر شیرانی کی ان نظموں کو جنھوں نے اختر شیرانی کو اختر شیرانی بنایا اور ان نظموں کو جو اختر شیرانی کی پہچان نہیں بن سکیں، ایک سطح پر رکھ کر عورت کے بارے میں اختر شیرانی کے تصور کی تکمیل کرنا چاہتے ہو، اور تمہیں اس حقیقت کا احساس نہیں ہوتا کہ کوئی تصور جب تک کسی شاعر یا فنکار کے تخلیقی وجدان میں جذب ہو کر اور اس کے پورے وجود میں تحلیل ہو کر اس کی اندرونی آواز نہ بن جائے اور اس کی شاعرانہ یا فنکارانہ انفرادیت سے ہم آہنگ ہو کر اس انفرادیت کا عکس جمیل نہ بن جائے، اس وقت تک اس تصور کو اس شاعر یا فنکار سے منسوب کرنا فن کی شریعت میں گناہ عظیم کے مترادف ہے۔ اس گناہ عظیم کے ارتکاب کا حق صرف مدرسانہ تنقید لکھنے والوں کو ہے اور تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کو تم ایسے ہی تنقید نگاروں کے لیے چھوڑ دو ورنہ ان کی حق تلفی ہوگی۔

اختر شیرانی کی شاعری میں ''عورت'' کا اصل تصور کیا ہے، اس کی نشان دہی ''اختر ستان'' کی اس نظم سے ہوتی ہے جس کا عنوان ہے ''عورت فنون لطیفہ کی دنیا میں'' اس نظم سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اختر شیرانی کی عورت شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے معنی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے، نقاب ساز میں آہنگ ہو کر تھراتی ہے، حریم رنگ و بو میں نشہ بن کر لہلہاتی ہے۔ اس کی نکہت تصویر کے رنگوں میں اور اس کی رنگت بتوں کے مرمریں پردوں میں آوارہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ عورت کا یہ تصور ارضی ہے یا ماورائی۔ اب رہ گئی اختر شیرانی کی وہ محبوبہ جسے تم نے ارضی قرار دیا ہے، تو ذرا اس کی حقیقت بھی سن لو۔ وہ سلمیٰ جو نور جہاں کے مزار پر آتی ہے، سلمیٰ نہیں سلمیٰ کا صرف ہیولیٰ ہے۔ جس کو دیکھ کر شاعر کو گمان ہوتا ہے کہ جیسے خلد سے حور جناں نکل آئی، جیسے نقاب گل سے شمیم نہاں نکل آئی، جیسے اپنی قبر سے نور جہاں نکل آئی...... جیتی جاگتی سلمیٰ کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ سلمیٰ جو تمہیں بستی کی لڑکیوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی دکھائی دیتی ہے، نہ مجھے کہیں دکھائی دی نہ شاعر کو، ہاں اس کی سہیلیوں میں زندگی کے کچھ آثار نظر آتے ہیں اور انھی ہی سے شاعر کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ دیکھو وہ جا رہی ہے سلمیٰ! نظر بچا، کرشما کے، مسکرا کے، آنچل سے منہ چھپا کر۔ شاعر کو کہیں سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ سلمیٰ کی سکھیاں اس کی داستان کو دہرا کے اس کی جان سلمیٰ کو چھیڑتی ہیں اور وہ حیا کی ماری زبان کو سی لیتی ہے۔ بہرحال جیتی جاگتی سلمیٰ سے شاعر کی کہیں ملاقات نہیں ہوتی۔ وہ ریحانہ جس کے بارے میں شاعر ہمیں اطلاع دیتا ہے کہ انھی صحراؤں میں وہ اپنے گلے کو چراتی تھی اور انھی چشموں پہ وہ ہر روز منہ دھونے کے لیے آتی تھی ایک جیتی جاگتی عورت کی صورت میں اپنے گلے کو چراتی اور چشموں پر منہ دھوتی ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ تو ریحانہ کا ایک ہیولیٰ ہے جو اس وادی میں مثل نکہت مستانہ، صورت افسانہ، برنگ نغمہ بیگانہ اور شمع حسن ہو کر بھی صورت پروانہ رہتی تھی اور بس۔

اور وہ دشمن ایماں جس کا حسن خراماں تمہیں دامن لارنس کے خوابیدہ پھولوں کے آس پاس نظر آتا ہے، مجھے تو اس کے بارے میں سرف اتنا معلوم ہے کہ شاعر نے اس کو ایک سیارہ بے آسماں سمجھا تھا اور اس رنگین فضا، اس چاندنی اور اس بے خودی میں وہ شاعر کو ایک حور جناں محسوس ہوئی تھی اور اس کا اظہار عشق شاعر کو ایک سرور آسماں معلوم ہوا تھا۔ میں شاعر کی ان ارضی محبوباؤں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں شبنم! ان سے زیادہ زندہ و توانا تو چین کی قدیم کہانیوں کی بدروحیں ہیں۔

شبنم صدیقی: سلیم بھائی ! آپ اختر شیرانی کے ہاں ''حسینوں'' کی جیتی جاگتی شکلیں دیکھنا چاہتے ہی جبکہ شاعر ''حسن'' سے پیمان وفا مضبوط رکھنا چاہتا ہے، اور شاعری میں آپ کے معنوی استاد ن م راشد کے بقول اختر شیرانی کے لیے حسن ہی کا دوسرا نام سلمیٰ ہے۔ بہر کیف اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اگر حسن کی جستجو کرنے والا شاعر حسن مثالی کی تلاش کے چکر میں اپنی حقیقی ارضی محبوباؤں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش نہیں کر سکا تو اس کا ''عشق'' تو بہرحال ارضی تھا! پھر آپ اس کے ''عشق'' کے سماوی اور ماورائی ہونے پر کیوں مصر ہیں؟ اور ایک اور سوال آپ سے یہ ہے کہ ایک شاعر جس کے کلام کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جنم جنم سے حسن کا پیاسا ہے اور کائنات کے ذرے ذرے سے حسن کا رس نچوڑ کر ایک مثالی دنیائے حسن تخلیق کرنا چاہتا ہے کیا حسن کی یہ ازلی اور ابدی تلاش اس کی شاعری میں عظمت کے ایک Dimension کا بھی اضافہ نہیں کر سکتی؟

سلیم احمد: شبنم! تم یہ بتاؤ کیا تم اختر شیرانی کی نظم ''سرزمین عشق'' کو اختر کی بہترین نمائندہ نظموں میں شمار نہیں کرتے؟

شبنم صدیقی: جی! بالکل کرتا ہوں۔

سلیم احمد: کیا تمھیں اس کے آخری دو بند یاد ہیں؟

شبنم صدیقی: جی ہاں یاد ہیں۔

سلیم احمد: ذرا سناؤ!

شبنم صدیقی:

ہاں یہ بہشتی سر زمیں اک ساز وجد انگیز ہے
جس کے سنہری پردوں میں ہر نغمہ خواب آمیز ہے
اور دیوتائے عشق کی پرواز سے لبریز ہے
ہمرنگ خواب رائگاں اک سر زمین عشق ہے

اک وادی اسرار ہے اک جلوہ گاہ ناز ہے
جس کی فضا میں موجزن اک سرمدی آواز ہے
اور جس کا ہر نغمہ گداز روح کی پرواز ہے
ہمتائے بوئے گلستان اس سر زمین عشق ہے

سلیم احمد: یہ تمہارے پہلے سوال کا جواب ہے جس ''عشق'' کی بہشتی سرزمین دیوتائے عشق کی پرواز سے لبریز ہے، ایک وادی اسرار ہے ۔ اس کی فضا میں ایک سرمدی آواز موجزن ہے۔ اس عشق کا تصور اگر سماوی اور ماورائی نہیں تو اور کیا ہے؟ اب میں تمہارے دوسرے سوال پر آتا ہوں۔ حسن کی تلاش بے شک شاعری میں بڑائی پیدا کرتی ہے۔ لیکن حسن کیا

صرف حسین چیزوں میں ہوتا ہے؟ میں تم سے یہ پوچھتا ہوں اگر ایک شاعر حسین اشیاء اور حسین مظاہر اور حسین مناظر سے حسن کشید کر کے اپنی شاعری میں پیش کرتا ہے تو وہ زیادہ باکمال ہے یا وہ زیادہ باکمال ہے جو زندگی کے کھردرے بھدے اور بے ہنگم مظاہر میں حسن تلاش کر لیتا ہے اور اسے اپنے فن میں ''حسن اظہار'' کی صورت میں پیش کرتا ہے؟ میں نے جب یہ کہا تھا کہ میں چاند بادل اور دریا کے الفاظ کے استعمال کو شاعری نہیں سمجھتا تو میرا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ چاند، بادل اور دریا زندگی اور شاعری سے خارج کر دیئے جائیں۔ میں تو چاند، بادل اور دریا تک شاعری کو محدود کر دینے والے جمال پرستوں کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ اگر تم نے چاند، بادل اور دریا کے حسن سے حسین شاعری تخلیق کر لی تو کیا کمال کیا؟ کمال تو جب ہے کہ یگانہ کی طرح Slang مظاہر کے مخفی حسن کو Slang محاوروں کے فطری حسن رکھنے والے لباس میں پیش کرو۔ اکبر الہ آبادی کی طرح زندگی کے بے تکے پن اور بے ڈھنگے پن میں حسن تلاش کرو اور اسے حس مزاح کے مخفی حسن سے آراستہ ہیئت میں ڈھالو۔ اقبال کی جمالیاتی شاعری کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ اور Process of Thinking میں جو ایک مخفی غنائیت ہوتی ہے اس کا ادراک کر کے اقبال کی خالص فکری موضوعات کی شاعری کے طرز پر شعری فن پارے تخلیق کر کے دکھاؤ۔ ''بانگ درا'' والا حسن پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ ''ضرب کلیم'' والا حسن پیدا کر کے دکھاؤ۔ بودلیئر کی طرح بدی کے مظاہر سے حسن سیاہ کشید کر کے دکھاؤ۔

بتاؤ شبنم کیا فن مصوری صرف چاندنی راتوں اور برسات کی گھٹاؤں اور پھولوں اور ستاروں اور خوبصورت پرندوں کی تصویر کشی کا نام ہے؟ کیا زندگی کے دوسرے مظاہر اور مناظر اس فن کی قلم رو سے خارج ہیں؟ کیا گندی گلیوں، قحط زدہ دیہاتوں، فاقہ زدہ چہروں، مریض جسموں، ڈیزل کے دھوئیں سے فضا کو مسموم کرتی ہوئی گاڑیوں کی تصویر کشی فن مصوری میں شجر ممنوعہ ہے، صرف اس لیے کہ یہ مناظر حسین نہیں ہیں؟ کیا حسن مصور کی نظر میں نہیں ہوتا؟ کیا مصور کا داخلی احساس جمال بھدی اور بدہیئت چیزوں کو آرٹ کے حسن میں نہیں ڈھال دیتا؟ کیا حسین چیزوں کی مصوری ہی حسین آرٹ ہے؟ کیا حسن اظہار کوئی چیز نہیں؟

اور پھر یہ بھی بتاؤ کہ کیا ایک عظیم مصور صرف حسین چیزوں اور حسین مناظر کی تصویر کشی کر کے آسودہ ہو جاتا ہے؟ کیا وہ اسے اپنے فن کی معراج سمجھ سکتا ہے؟ کیا وہ زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق کو اپنے فن میں سمونہیں دینا چاہتا؟ کیا وہ کوڑھ اور تپ دق کے مکروہ صورت مریضوں کے چہروں کو اپنا موضوع بنا کر حسین اور عظیم فن کی تخلیق نہیں کرتا؟ آخر شاعری بھی تو الفاظ کی مصوری ہے۔ رومانی شاعر اس مصوری کے دائرے کو صرف So-Called معروف جمالیات تک کیوں محدود رکھنا چاہتا ہے؟

شبنم صدیقی: سلیم بھائی عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اختر شیرانی کی رومانی شاعری سے متاثر ہونے والا صرف اس کی حسی سطح کی جمالیات اس کی رقت آمیز شدت احساس اور اس کی خواب آلود غنائیت سے مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میں نے اختر شیرانی کے ہاں کیا محسوس کیا ہے۔ میں اپنی زندگی میں سب سے زیادہ جس احساس سے مسحور ہوا ہوں اور جس احساس نے میرے سازِ دل کے تاروں کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مرتعش کیا ہے وہ ماضی کی یادوں کا تڑپا دینے والا تاثر ہے۔ اور یہ تاثر اختر شیرانی کی شاعری میں صرف ایک غالب موضوع کی

حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ مجھے تو اختر کی نظمیں پڑھتے وقت اختر شیرانی کی شاعری کے زیروبم، اس کے آہنگ اور اس کی موسیقی کے نشیب وفراز میں ماضی کی یادوں کا یہ انتہائی لطیف اور دلگداز تاثر اپنی پوری شدت کے ساتھ امنڈتا اور منڈلاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی تاثر نے آج تک مجھے اختر شیرانی کا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ میرے اس جذبہ بے اختیار پر آپ کا تبصرہ کیا ہے؟

سلیم احمد: شبنم! بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ؟

اس موضوع پر تفصیلی گفتگو تو اس وقت ہوگی جب ہم کسی ایسی ہی نشست میں شاعری کی ہئیت اور اس کے معیار عظمت پر جی بھر کر بات کریں گے۔ فی الحال تو اتنا ہی کہوں گا کہ اختر شیرانی کی نظموں کے شعری آہنگ میں تو تمہیں ماضی کی یادوں کا انتہائی لطیف اور دلگداز تاثر منڈلاتا اور امنڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے، مگر کیا اقبال کی ''مسجد قرطبہ'' اور ''ذوق وشوق'' کے آہنگ میں تمہیں تاریخ انسانی کی صدیاں گونجتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی ہیں؟ بتاؤ کس میں زیادہ عظمت ہے۔ کس میں زیادہ گمبھیرتا ہے۔ کس میں زیادہ Sublimity ہے!

شبنم صدیقی: اس سلسلے میں میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کی شاعری میں میں جس عظمت کو محسوس کرتا ہوں اس کا شمہ بھر بھی اختر شیرانی کے ہاں نہیں پاتا، اور اس عظمت کا احساس اسی تاثر کی بنا پر ہے جس کی طرف آپ نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ ''مسجد قرطبہ اور ''ذوق وشوق'' کو میں اردو شاعری کے عظیم ترین معجزوں کی حیثیت دیتا ہوں۔ اختر شیرانی کے بارے میں میری پسندیدگی بلکہ مجذوبیت کی وجوہ بہت حد تک ذاتی ہیں۔ میں عظیم شاعری کے Tone کو پہچانتا ہوں اور اقبال کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں کسی شک کا میرے دل میں ذرہ برابر گزر نہیں۔

ہاں ایک بات اور پوچھتا چلوں۔ آپ نے ابھی ابھی شاعری کی عظمت کے حوالے گمبھیرتا اور Sublimity کے الفاظ ایک سانس میں استعمال کیے ہیں۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ Longinus نے جس چیز کو Hypsos کہا ہے اور جس کا انگریزی ترجمہ Sublime کیا گیا ہے اس سے اس کی مراد شاعری کی وہی خصوصیت ہو جس کے لیے ہمارے یہاں گمبھیرتا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سوال اس پس منظر میں اور اہم ہو جاتا ہے کہ ہمارے بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ Longinus کی اس اصطلاح کا مکمل اور صحیح مفہوم اردو کے کسی لفظ رفعت ارفعیت یا علویت سے ادا نہیں ہوسکتا؟ آپ کی زبان پر چونکہ یہ دونوں الفاظ بے ساختہ ایک ساتھ آئے ہیں اس لیے کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ غیر شعوری طور پر اس اصطلاح کا صحیح ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہوں؟

سلیم احمد: ایسا ہوسکتا ہے۔ لیکن میں یقین کے ساتھ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر بھی اسی وقت گفتگو ہوگی جب ہم شاعری کی ماہیت اور اس کے معیار عظمت پر گفتگو کریں گے۔

شبنم صدیقی: سلیم بھائی میں نے دوسرا مقدمہ جو آپ پر دائر کیا تھا، اس کے بارے میں آپ کے بیان حلفی کا منتظر ہوں۔

سلیم احمد: تمہارا دوسرا مقدمہ بہت کمزور ہے شبنم! میں نے ترقی پسند دانشوروں کی طرح ادب کو غیر ادبی معیاروں سے نہیں پرکھا

اور نہ میرے ذہن میں حقیقت پسندی کا کوئی ایسا تصور ہے جو ترقی پسندوں کے خیالات سے کسی نوع کی مطابقت رکھتا ہو۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ فنکار کی عظمت کا سرچشمہ میں اس کے احساس و ادراک کی سچائی کو سمجھتا ہوں اور احساس و ادراک کی سچائی ایک خالصتاً فنی محرک ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس شاعر کے احساس و ادراک میں سچائی کا جوہر ہے اور اس پر کسی انا پرستی کا منحوس سایہ نہیں پڑا، وہ زندگی کو انسان کو اور عورت کو محبت کو اور حسن کو اس کی کلیت کے ساتھ اپنی شاعری کا موضوع بنائے گا۔ اگر کسی شاعر کے ہاں چیزوں کا کسری تصور ملتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا احساس و ادراک انا پرستی کے ہاتھوں مجروح ہو چکا ہے اور اس کی فنکارانہ سچائی دم توڑ چکی ہے۔ اور فنکارانہ سچائی کے بغیر سچا، عظیم اور ابدیت سے ہمکنار ادب پیدا نہیں ہوسکتا۔ اسی معیار کو سامنے رکھ کر میں نے اختر شیرانی اور اس سے Inspire ہونیوالے رومانی شعراء کی شعری قدر و قیمت کا جائزہ لیا ہے۔ یہ غیر ادبی معیار نہیں، خالصتاً ادبی معیار ہے۔

شبنم صدیقی: سلیم بھائی! احساس و ادراک کی سچائی کا دعویٰ تو ترقی پسند بھی کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ احساس و ادراک کی سچائی کے جوہر کو اپنے سماجی شعور سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے سماجی شعور کو اپنی انسان دوستی کے جذبے پر مبنی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان دوستی کے جذبے کے بغیر بڑا ادب پیدا نہیں ہوسکتا۔ یعنی وہ ادب کی عظمت کا معیار ایک داخلی احساس کو قرار دیتے ہیں جس سے جسمانی شعور پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح ادب کی عظمت کا معیار اپنے آخری تجزیے میں ان کے ہاں بھی ادبی ہی قرار پاتا ہے، غیر ادبی نہیں۔ اب رہ گیا انسان کو اس کی کلیت میں دیکھنے کا سوال تو ان کا دعویٰ بھی اس سلسلے میں یہی ہے کہ وہ فرد کو سماج کے بغیر مکمل نہیں سمجھتے، اس لیے وہ فرد کی کلیت کا تعین اس کے سماجی تناظر میں کرتے ہیں۔ اس سماجی تناظر میں اپنے دعوے کے مطابق وہ زندگی کو انسان کو، عورت کو، محبت اور حسن کو اس کی کلیت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان کے ہاں انسان کی کلیت کا تصور آپ کے تصورِ کلیت سے مختلف ہے مگر ان کے استدلالی خطوط تو وہی ہیں جو آپ کے ہیں، تو پھر آپ کے طریق استدلال اور ان کے طریق استدلال میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

سلیم احمد: شبنم! ادب کے تعین عظمت کے سلسلے میں تم نے جس طرح ترقی پسندوں کے غیر ادبی معیار کو ادبی معیار ثابت کیا ہے، اس سے صرف اتنی بات سامنے آتی ہے کہ اگر تم ترقی پسند ہوتے تو تمہارا طریق استدلال کیا ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے تمہارے اندر اختر شیرانی کے بجائے کوئی ترقی پسند سما گیا ہے اور تم اس کی وکالت کر رہے ہو، جس طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے تم اختر شیرانی کی وکالت کر رہے تھے۔ یہ بالکل تمہارا اپنا اندازِ فکر ہے ورنہ ترقی پسند تو صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ ان کے ہاں ادب کی عظمت کا معیار غیر ادبی ہے وہ تو اس سلسلے میں Eliot تک کو Quote کرتے ہیں۔

حقیقت صرف اتنی ہے کہ ان کی انسان دوستی ان کا داخلی احساس ہے ہی نہیں، نہ ان کا سماجی شعور کسی داخلی احساس یا کسی خلوص پر مبنی ہے۔ یہ تمام چیزیں ان پر اوپر سے تھوپ دی گئی ہیں۔ ان کی انسان دوستی کا جذبہ مگرمچھ کے آنسوؤں سے زیادہ کچھ

نہیں۔ ان کا سماجی شعور ایک مانگے کی چیز ہے جو انہیں کہیں سے مل گئی ہے۔ ان دونوں لباسوں میں وہ اپنا اصل اندروں چھپاتے ہیں، اس لیے یہ دونوں چیزیں ان کے ہاں درحقیقت ماسک سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔لیکن اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ ان کا سماجی شعور سچا ہے اور وہ انسان کو اس کے سماجی رشتوں کے ساتھ ایک کلیت میں دیکھتے ہیں تو اس سے ثابت کیا ہوتا ہے، یہی کہ ان کا یہ عمل اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خارجی عمل ہے۔ اس لیے کہ سماج ایک خارجی Institution ہی تو ہے جو ان کی ذات سے باہر واقع ہوتا ہے۔

دیکھو شبنم! سچے ادب کی تخلیق ایک داخلی عمل ہے، خارجی عمل نہیں۔ یہ عمل اس وقت نمود پذیر ہوتا ہے جب انسان کی ذات کی کلیت کو اس کے اندر رہ کر متعین کیا جائے۔ اگر اس کا رشتہ خدا سے بھی متعین کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ خدا انسان کی ذات کے اندر ہے۔مگر سماج انسان کی ذات کے اندر نہیں ہے۔ وہ اس کی ذات سے باہر ہے۔ اس لیے انسان کے سماجی رشتوں کا تعین اور ان رشتوں کی روشنی میں اس کی کلیت کا تعین ایک خارجی عمل ہے اور یہ خارجی عمل بتاتا ہے کہ انسان کی ذات میں کلیت نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ وہ سماج کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس جب انسان کی ذات کی کلیت کو اس کے اندر رہ کر متعین کیا جاتا ہے تو بے شمار داخلی تضادات ایک دوسرے سے ٹکراتے اور بالآخر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اس داخلی تصادم اور اس داخلی ہم آہنگی سے بالآخر سچا ادب تخلیق ہوتا ہے جس میں اضطراب اور طمانیت کی کیفیات بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔بات دراصل یہ ہے کہ سچا ادب ذات کی Analysis سے لے کر ذات کی Synthesis تک کے تخلیقی عمل کا نام ہے۔ ذات کی Analysis سے اس کے اندر بے شمار متضاد عناصر کی پیکار کا عمل شروع ہوتا ہے جو ایک تخلیقی اضطراب کو جنم دیتا ہے۔ یہ اضطراب جب اپنی انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو ذات کی Synthesis کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ ان متضاد عناصر کی پیکار کے اختتام کے بعد ان کی ہم آہنگی بلکہ ان کے باہمی انضمام کے عمل کا نام ہے۔ اس سے ذات کی اکائی مکمل ہو جاتی ہے اور یہ عمل بالآخر اس کیفیت کو جنم دیتا ہے جسے تخلیقی طمانیت کہتے ہیں۔ Synthesis کا یہ عمل تخلیقی اضطراب اور تخلیقی طمانیت کو بھی ایک وحدت میں تبدیل کر دیتا ہے۔اب تم بتاؤ کہ ذات کو اپنی کلیت میں دیکھنے کا عمل تخلیقی عمل ہے یا اس کو سماجی رشتوں کے ساتھ دیکھنے کا عمل تخلیقی عمل ہے۔ فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔

ایک بات اور سمجھ لو۔ ترقی پسندوں کے ہاں سماج ایک بنیادی حقیقت ہے اور انسان ذات کی تفہیم اس کے تابع رہ کر اس کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس میری سوچ یہ کہتی ہے کہ بنیادی حقیقت انسان کی ذات ہے اور سماج کی تفہیم اس کے حوالے سے ہونی چاہیے۔ سچی ادبی تخلیق میں تخلیقی عمل کا دھارا ذات سے ذات کی طرف بہتا ہے اور پھر ذات سے سماج کی طرف نہ کہ سماج سے ذات کی طرف۔تو یہ ہے وہ سچا تخلیقی عمل جس کو میں نے ادب کی پرکھ کا معیار بنایا ہے۔اب تم خود سوچ لو کہ کیا ادب کی عظمت کے تعین کے سلسلے میں میرا طرز استدلال وہی ہے جو ترقی پسندوں کا ہے!

شبنم صدیقی: اچھا تو سلیم بھائی پھر کیا خیال ہے، Good Bye to Akhtar Shirani کہہ دیا جائے؟

سلیم احمد: میں تو بہت پہلے موصوف کو Good Bye کہہ چکا ہوں۔ مسئلہ اصل میں تمہارا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم اپنے شعری سفر میں بھی اور تنقیدی شعور کے سفر میں بھی اختر شیرانی کی منزل کو Cross کر کے ن م راشد کی اقلیم میں

داخل ہو جاؤ یعنی ''ٹینی سن'' کی شعری حسیت سے آگے بڑھ کر ''براؤننگ'' کی Poetic Sensibility کی طرف آ جاؤ تو گڈبائی ٹو اختر شیرانی کا عمل از خود تکمیل پذیر ہو جائے گا۔

شبنم صدیقی: اس وقت تو سلیم بھائی میں آپ کو ''گڈبائی'' کہنے کے موڈ میں ہوں۔ اس لیے کہ رات بہت ہو چکی ہے اور آپ کے سگریٹ بھی ختم ہو گئے ہیں۔ تو پھر خدا حافظ!

سلیم احمد: خدا حافظ شبنم! شب بخیر!!